دارالعلوم دیوبند

قیام، پس منظر، مقاصد
اور خدمات کا اجمالی تذکرہ

مولانا مفتی محمد ظفیر الدین
مرتب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند

شائع کردہ
دفتر اجلاس صد سالہ دارالعلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ

وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْن

برصغیر ہند و پاک اور بنگلہ دیش میں ایک ایسا دور بھی گذرا ہے، جس میں انسانی مجد و شرف، اخوت و محبت بالخصوص عقاید و اخلاق اور کتاب و سنت کی اشاعت و ترویج خطرات میں گھر چکی تھی اور اسلامی تہذیب و معاشرت اور دینی فکر و نظر موت و حیات کی کشمکش سے دوچار تھی، الحاد و دہریت کا سیلاب موجزن تھا اور نئے نئے مذہبی فتنے اور مختلف گمراہ کن تحریکیں سر ابھار رہی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مسلمانوں کا دین قیّم پر جمے رہنا مشکل ہو جائے گا۔

اس پُر آشوب و پُر فتن دور میں دارالعلوم دیوبند اور اس کے فرزندوں نے جو عظیم الشان اور دور رس دینی، علمی، تعلیمی، تصنیفی اور سیاسی و ملّی خدمات انجام دیں وہ کسی جو کس حکومت کی خدمات سے ہر گز کم نہیں۔

آج برصغیر میں اعمال و اخلاق کی پاکیزگی و بلندی، عقاید و معاملات کی پختگی و صفائی اور انسانیت و شرافت کی بو باس جو کچھ باقی ہے، یا رُو بترقی ہے یقیناً یہ سب دارالعلوم دیوبند اور ان کے فضلاء کی جد و جہد اور مسلسل محنت و کاوش کا ثمرہ اور اس کے اکابر و اسلاف کی دعائے نیم شبی اور اخلاص و ایثار کا نتیجہ ہے۔

اس ملک میں جب جدید تہذیب انگریزی حکومت کے زیر سایہ اسلامی تہذیب پر حملہ آور ہوئی تو اُس وقت اس کے مقابلہ کے لئے علماء دیوبندؒ اور مشائخ ملّت اپنی جگہ پہاڑ کی سی مضبوطی سے جم گئے اور اسلامی تہذیب و معاشرت اور دینی افکار و اقدار کو انگریزوں کی دستبرد سے صاف بچالے گئے۔

اسی طرح برصغیر کی جنگ آزادی میں دارالعلوم دیوبند، اس کے اسلاف و اکابر اور فرزندوں نے جو بنیادی کردار ادا کیا ہے، ہندوستان کی تاریخ کا زرّیں باب ہے، برصغیر کی آزادی کا جھنڈا سب سے پہلے انہی حضرات نے بلند کیا اور ملک کے باشندوں کو بلا امتیاز مذہب و ملّت اس جھنڈے کے نیچے جمع کرنے کی جدوجہد کی اور پھر خود آگے بڑھ کر سبھوں سے زیادہ قربانی پیش کی، ملک کے گیسو سنوارنے اور اس کو آزادی اور امن و سلامتی کی دولت سے مالامال کرنے میں ان نفوس قدسیہ کا بہت بڑا حصّہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ غیر ممالک میں جو شہرت و عزت دارالعلوم دیوبند کو حاصل ہے وہ یہاں کے کسی دوسرے تعلیمی ادارے کو حاصل نہیں، آزادی سے پہلے بیرونِ ملک کے خواص و عوام جس قدر دیوبند کے نام سے مانوس تھے، دہلی اور دوسرے شہروں کے نام سے نہیں تھے۔

پھر اس درمیانی پُرآشوب اور صبر آزما دور میں علمائے دیوبند نے کتاب و سنت کی اشاعت اور دینی احکام و مسائل سے لوگوں کو روشناس کرنے میں جو عظیم کارنامہ انجام دیا ہے وہ اپنی آپ مثال ہے، جب ممالک

اسلامیہ میں علم حدیث و قرآن کا چرچا بہت کم ہو رہا تھا اُس وقت دیو بند کی درسگاہیں قال اللہ اور قال الرسول سے پُر شور تھیں، اور یہاں صرف برصغیر کے گوشہ گوشہ کے نوجوان ہی جمع نہیں تھے بلکہ سمرقند و بخارا، افریقہ، برما افغانستان اور دوسرے ممالک کے کونے کونے سے طلبۂ علوم دینیہ کشاں کشاں آرہے تھے اور دارالعلوم دیو بند سے علم کی دولت لے کر اپنے اپنے ملکوں اور خطوں کو واپس ہو رہے تھے، اور وہاں علومِ دینیہ کی شمعیں روشن کر رہے تھے۔

یہ درمیانی پُرآشوب دور ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا جب ۱۷۱۷ء میں شاہ فرخ سیر نے اس ملک میں انگریزوں کو تجارت کی اجازت دی تھی اور ان کی تجارت کو مخصوص ٹیکسوں اور چنگی سے مستثنیٰ قرار دیدیا تھا، اور پھر ۱۷۶۵ء میں شاہ عالم ثانی نے باضابطہ چند شرائط کے ساتھ بہار، بنگال اور اڑیسہ کی دیوانی صرف اکیس لاکھ سالانہ کے عوض ان کے ہاتھوں میں دیدی اور اس کے نتیجہ میں طاقت پا کر لارڈ لیک نے ۱۸۰۳ء میں دہلی پر حملہ کر کے شاہ عالم ثانی کو گرفتار کیا اور اسے اس معاہدہ کے لکھنے پر مجبور کیا کہ:۔

"شاہ عالم کی حکومت شہر، قلعہ اور اطرافِ دہلی قطب مینار تک محدود رہے گی اور بقیہ ملک پر انگریزوں کا تسلّط رہے گا، اور اب مسلمانوں کے حقوق کی نگہداشت بادشاہ سلامت کی جگہ کمپنی کے ذمہ ہو گی۔"

یہی حالات تھے جن سے متاثر ہو کر خاندانِ ولی اللّٰہی کے چشم و چراغ سراج الہند حضرت شاہ عبد العزیز محدّث دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) نے ہندوستان کے دار الحرب ہونے کا فتویٰ دیا اور اعلان فرمایا کہ اس شہر دہلی میں مسلمانوں کے امام کا حکم قطعاً جاری نہیں ہے بلکہ عیسائی سرداروں کی حکمرانی ہے اور دہلی سے کلکتہ تک نصاریٰ کا اقتدار قائم ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ برصغیر کتاب و سنت اور اسلامی تعلیمات کی جس روشنی سے منور تھا اور جس کی تابانی سے یہ پورا خطہ بقعۂ نور بنا ہوا تھا، آپ کی حیات میں ہی اس میں اضمحلال شروع ہو چلا تھا، اور یہی وجہ ہے کہ آپ کے فیض یافتہ مشہور مجاہد حضرت سید احمد بریلوی شہید (ش ۱۲۴۶ھ) اور آپ کے نامور بھتیجے مولانا محمد اسماعیل شہید (ش ۱۲۴۶ھ) نے آپ کے ایماء سے ایک منظم جماعت کے ساتھ دینی انقلاب برپا کرنے کی ملک گیر اور بھرپور جدوجہد کی، ملک کا سارا دیندار اور دور اندیش طبقہ اس دینی جدوجہد میں آپ حضرات کے ساتھ تھا، خود شہیدین اور آپ کے مخصوص رفقاء اس جدو جہد میں پیش پیش تھے، جس کی شہادت بالاکوٹ کی زمین کا ذرہ ذرہ آج بھی زبان حال سے دے رہا ہے، جہاں ان مجاہدین نے جہاد کرتے ہوئے اس طرح جان دی کہ :-

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

خاندانِ ولی اللہٰی کے ایک دوسرے نیّر تاباں حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق صاحب دہلوی (م ۱۲۶۲ھ) اپنے نانا جان حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی اُس مسند درس و تدریس اور تعلیم و تعلّم کو آباد کیے ہوئے تھے، جسے شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) کے پدر بزرگوار حضرت شاہ عبدالرحیم (م ۱۱۳۱ھ) نے دہلی میں بہت پہلے بچھائی تھی اور جس کی خدمات اور غلغلہ سے پورا برصغیر علم دین سے پُرشور تھا، مگر ۱۲۵۸ھ میں حالات سے مایوس و مجبور ہو کر ان کو بھی ہجرت کی راہ اختیار کرنا پڑی۔

آپ کے بعد درسِ حدیث کا چرچا مجدّدی خاندان کے ایک بزرگ حضرت مولانا شاہ عبدالغنی مجددی (م ۱۲۹۶ھ) سے قائم تھا جو اسی خاندانِ ولی اللہی کے شاگرد رشید تھے، علم و عمل کے چشمے اب یہیں سے پھوٹ پھوٹ کر پورے ملک کو سیراب کر رہے تھے، مگر حالاتِ زمانہ اور انقلاب وقت نے اس محدّثِ وقت کے جمے ہوئے قدم کو بھی ہلا ڈالا اور ۱۲۷۳ھ میں آپ بھی برصغیر کی زمین چھوڑ دینے پر مجبور ہو گئے۔

ستمبر ۱۸۵۷ء کے طوفان پر اس پُرآشوب دور کا شباب مکمل ہو گیا، جس کے جھونکے سے سلطنت مغلیہ کا ٹمٹماتا چراغ گُل ہو گیا، اور پورے ملک پر انگریزوں کی حکمرانی قائم ہو گئی اور وہی اس ملک کی سیاسی قسمت کے مالک بن گئے۔

پھر کیا ہوا، مسلمانوں کا قتل عام ہوا، علماء بے دریغ تہ تیغ کیے گئے، دہلی

اور دہلی کے سارے مدارس و دینی مراکز ایک ایک کر کے برباد ہو گئے، بچے کھچے علماء اور مشائخ جزیرہ انڈمان لے جا کر قید کر دیئے گئے، جہاں طرح طرح اذیتیں برداشت کر کے انہوں نے بے کسی اور کس مپرسی کے عالم میں جان دی۔

اب نہ علم و فضل کی شمعیں روشن تھیں اور نہ اقتدار و اختیار کا کوئی شمّہ باقی رہ گیا تھا، بہادر شاہ ظفر گرفتار کر کے ملک سے باہر بھیجے جا چکے تھے، لال قلعہ ویران تھا اور دہلی کی جامع مسجد مرثیہ خواں۔

انگریزی تسلط و اقتدار سے پہلے دہلی، لاہور، آگرہ، جونپور اور اسی طرح گجرات، بہار، مدراس اور بنگال کے مختلف شہروں اور آبادیوں میں جو دینی درسگاہیں قائم تھیں اور جن میں مسلمان نوجوان اور بچے تعلیم پا رہے تھے وہ سب بند ہو چکی تھیں، کیونکہ ان کے اخراجات مغلیہ سلطنت کے خزانے یا مسلمان امراء کی جیبوں سے پورے ہوتے تھے یا پھر اُن اوقاف اور معافیات کی آمدنیوں سے جن کو مسلمانوں نے اسی کام کے لئے وقف کر رکھے تھے، مگر انگریزی اقتدار کے بعد یہ سب تباہ و برباد ہو چکے تھے یا بحق انگریزی سرکار ضبط ہو چکے تھے ڈبلو۔ ڈبلو ہنٹر نے لکھا ہے :۔

"ہم نے ان کے طریقۂ تعلیم کو بھی اس سرمایہ سے محروم کر دیا، جس پر اس کی بقا کا دار و مدار تھا، بنگال کا ہر اعلیٰ خاندان ہر ایسے مدرسہ کا خرچ برداشت کرتا تھا جس میں خود اس کے بچے اور غریب ہمسایوں کے بچے مفت تعلیم حاصل کر سکتے تھے

جوں جوں صوبہ کے مسلمان خاندانوں پر ادبار چھاتا گیا، یہ
خاندانی مدرسے کم ہوتے گئے، اور ان کے اثرات بھی بتدریج
مٹتے گئے" (ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۲۵۴)

دوسری جگہ معافیات اور اوقاف کے ضبط کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"اس سے سیکڑوں پرانے خاندان تباہ ہوگئے، اور مسلمانوں
کا تعلیمی نظام جس کا دارومدار انہی معافیات پر تھا، بالکل
تہ و بالا ہوگیا، مسلمانوں کے تعلیمی ادارے اٹھارہ سال
کی مسلسل لوٹ کھسوٹ کے بعد یک قلم مٹ گئے"
(ایضاً ص۲۵۷)

انگریزی حکومت نے اس ملک میں اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد جس نظام تعلیم کو جاری کیا اس میں مذہبی تعلیم کی سرے سے کوئی گنجائش نہیں تھی، خود اسی انگریز مصنف ہنٹر نے لکھا ہے:-

"ہمارے طریقہ تعلیم میں نوجوان مسلمانوں کے لئے مذہبی تعلیم
کا کوئی انتظام نہیں" (ایضاً ص۲۵۲)

نئی انگریزی حکومت نے اُن تعلیمی اوقاف کی آمدنی کا ناجائز استعمال کیا جو مسلمانوں نے اس کام کیلئے وقف کر رکھے تھے، چنانچہ ہنٹر لکھتا ہے:-

"مسلمانوں کے اس الزام کا جواب نہیں دیا جاسکتا ہے کہ
ہم نے ان کے تعلیمی اوقاف کا ناجائز استعمال کیا، اس

حقیقت کو چھپانے سے کیا فائدہ کہ مسلمانوں کے نزدیک اگر ہم اس جائداد کو جو اس مصرف کے لئے ہمارے قبضہ میں دی گئی تھی، ٹھیک ٹھیک استعمال کرتے تو بنگال میں ان کے پاس آج بھی نہایت اعلیٰ اور شاندار تعلیمی ادارے ہوتے۔"

(ایضاً ص۲۵۸)

تعلیمی نظام برباد کرنے کے ساتھ انگریزی حکومت نے مسلمانوں کی مذہبی زندگی پر بھی بھرپور وار کیا اور ان کی عائلی زندگی برباد کرنے کی پوری کوشش کی، چنانچہ یہی انگریز مصنف لکھتا ہے :۔

"مجلس قانون ساز کے ایک ایکٹ کی رُو سے ان کے مذہبی اور شخصی قوانین برباد کرنے کے لئے ضروری منصب داروں سے بھی مسلمانوں کو محروم کر دیا گیا۔۔۔۔۔ مسلمانوں کو ہم سے شکایت ہے کہ ہم نے ان سے مذہبی فرائض کو پورا کرنے کے ذرائع چھین لئے اور اس طرح روحانی اعتبار سے ان کے ایمان کو خطرہ میں ڈال دیا ہے۔"

آگے لکھتا ہے :۔

"ہمارا ایک بڑا جرم ان کے نزدیک یہ بھی ہے کہ ہم نے مسلمانوں کے مذہبی اوقاف میں بددیانتی سے کام لیتے ہوئے اُن کے سب سے بڑے تعلیمی سرمایہ کا غلط استعمال کیا۔" (ایضاً)

مذہب کی اہمیت کم کرنے کے لئے انگریزی حکومت نے قاضیوں کا تقرر بھی بند کردیا، اور اس کی وجہ اس نے یہ بتائی کہ قضا کا برقرار رکھنا اور قاضیوں سے کام لینا

"گویا اس بات کا اقرار ہے کہ حکومت (انگریزی) ان (مسلمانوں) کی حیثیت کو قبول کرتی ہے.... حکومت بمبئی کی طرف سے پرزور احتجاج کے بعد سابقہ تمام قوانین منسوخ کردئے گئے اور حکومت نے باقاعدہ قاضیوں کا تقرر بند کردیا" (ایضاً ص۲۶۶)

یہ ساری قانونی کارروائی ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی ایسٹ انڈیا کے نام سے عمل میں آچکی تھی اور مسلمان ان ساری رعایتوں سے محروم ہوچکے تھے جیساکہ عرض کیا ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے مسلمانی حکومت کا بچا کھچا نام ونشان تک مٹادیا، اور اس کے بعد مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ پڑی، جان ومال، عزت وآبرو اور حکومت و دولت مسلمانوں کے پاس کچھ باقی نہیں رہی۔

حد یہ ہے مسلمانوں کے دینی جذبات اور اسلامی غیرت وحمیّت کو بھی بیدردی سے کچلا گیا، مدارس و دینی مراکز ایک ایک کرکے بند ہوگئے، دہلی جو علم وعرفان کی مرکز کہی جاتی ہے، لُٹ چکی تھی، ۱۸۵۷ء کے ایک روزنامچہ میں درج ہے:

"دہلی میں قتل عام کا حکم دیدیا گیا ہے، بے گناہ شہریوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا ہے، ہزارہا نوجوان، بوڑھوں،

عورتوں اور معصوم بچوں کو مکان میں بند کر کے خاکستر کر دیا گیا
انگریز جنرل غضبناک ہے اس نے میجر رینارڈ (RENARD)
کو حکم دیا ہے کہ تمام قصبہ فتحپور کی آبادی کو تہ تیغ کر دیا جائے
کیونکہ اس جگہ ایک عیسائی گرجا کی تعمیر میں رکاوٹ ڈالی گئی تھی
اور نصاریٰ کے پادریوں نے اس کی جنرل سے شکایت
کی تھی "

ارباب حل وعقد اور دینی پیشواؤں کے لئے یہ وقت سخت نازک اور صبر آزما تھا، وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ حکومت گئی، دولت و ثروت گئی، شان و شکوہ گیا، علماء دین کی ایک بڑی جماعت بھینٹ چڑھ چکی لے دے کر مذہب رہ گیا ہے وہ بھی خطرہ میں ہے، کیونکہ پادریوں کا ایک جم غفیر برصغیر کی سرزمین پر دندنا رہا ہے، اسلام اور پیغمبر اسلام پر حملے کر رہا ہے، تعلیمات اسلام پر غلط اعتراضات کی بوچھاڑ ہے اور اس کے مقابلے میں عیسائی اعتقادات کی اشاعت ہو رہی ہے اور اس کے محاسن و مناقب بیان کئے جا رہے ہیں۔

پیغام محمدی میں اخبار نور الانوار ۲۳ اگست ۱۸۹۰ء کے حوالہ سے لکھا ہے:۔

" دیسی پادریوں کے علاوہ جن کا کوئی شمار نہیں، صرف نوسو (۹۰۰)
ولایتی پادری تھے جو تندہی کے ساتھ (عیسائیت کی) تبلیغ میں

مصروف تھے، اس کے علاوہ ایک مُکتی فوج تھی، جس کے اسّی دستے ان کی پشت پناہی اور امداد کرتے تھے، اور انکے کام میں ہاتھ بٹاتے تھے۔"

(سیرت مولانا محمد علی مونگیری ص۴۲)

برطانوی دارالعوام (پارلیمنٹ) میں ۱۸۵۷ء کے آغاز میں اعلان کیا گیا تھا:

"خداوند تعالیٰ نے ہمیں یہ دن اس لئے دیکھایا ہے تا کہ عیسیٰ مسیح کی فتح کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرائے، ہر شخص کی تمامتر قوت ہندوستان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنی چاہیئے اور اس میں کسی طرح کا تساہل نہیں ہونا چاہیئے۔"

مختصر یہ کہ کہیں تعلیم و ترقی کے نام پر مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی جدوجہد جاری تھی اور کہیں لوگوں کی وقتی غربت و افلاس اور مجبوری و بیکسی سے فائدہ اٹھاکر انھیں عیسائی مذہب قبول کرنے پر مجبور کیا جا رہا تھا، کیونکہ ابتداءً انگریزی حکومت کی پالیسی تھی کہ جیسے بھی ہو پورا برصغیر عیسائی مذہب کے دامن سے وابستہ ہو جائے، تاکہ حکومت کو کوئی خطرہ باقی نہ رہے۔

اس طوفانی انقلاب نے اس وقت کے علماء کرام اور مشائخ عظام کو

جھنجھوڑ ڈالا، اسلامی تعلیمات کے بقا و تحفظ، کتاب و سنت کی ترویج و اشاعت اور مسلمانوں کو اپنے دین پر جمائے رکھنے کا مسئلہ بڑا اہم اور سنگین بن کر سامنے تھا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اس سراسیمگی اور حیرانی و پریشانی کے پرآشوب زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے کچھ وفادار بندوں میں جرأت و ہمت پیدا کردی، چنانچہ انھوں نے جان و مال سے بے پروا ہو کر دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور اسلامی تعلیمات کے تحفظ اور اس کی اشاعت کے لئے سینہ سپر ہو گئے۔

دارالسلطنت دہلی سے قریب تھانہ بھون ضلع مظفر نگر میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ (م ۱۳۱۷ھ) کی قیادت میں علماء وقت سر جوڑ کر بیٹھے مولانا عاشق الٰہی تذکرۃ الرشید ص ۷۴/۱ میں لکھتے ہیں :-

"یہ لوگ حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ بلا کسی حاکم کے گذران دشوار ہے، اس لئے آپ چونکہ دینی سربراہ ہیں، اس لئے دنیاوی نظام حکومت کا بار بھی اپنے سر رکھیں اور امیر المومنین بن کر ہمارے باہمی فیصلے چکایا کریں، اس میں شک نہیں کہ اعلیٰ حضرت (حاجی امداد اللہ) کو ان کی درخواست کے موافق ان کے سروں پر ہاتھ رکھنا پڑا اور آپ دیوانی و فوجداری اور جملہ مقدمات شرعی فیصلہ کے مطابق

چند روز تک قاضی شریعت بن کر فیصل بھی فرماتے رہے، ادھر اعلیٰ حضرت کو حکومت کے فیصلے اور شرعی قضا میں مولوی کی ضرورت تھی کہ حق بات میں اعانت کرتا رہے، اس لئے آپ یعنی مولانا رشید احمد اور مولانا محمد قاسم صاحب (نانوتویؒ) مع خدّام یہیں (تھانہ بھون میں) رہ پڑے۔"

شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ تحریر فرماتے ہیں:

"مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو سپہ سالار اور مولانا گنگوہی کو قاضی بنایا گیا۔" (نقش حیات ص۴۳)

ان حضرات نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں کھُل کر حصّہ لیا اور شاملی کے میدان میں انگریزی فوج کا باقاعدہ مقابلہ کیا، اسی جنگ میں حافظ محمد ضامنؒ شہید ہوئے، مگر جب دہلی کے ہاتھ سے نکل جانے اور بہادر شاہ ظفر کے گرفتار کر لئے جانے کی اطلاع ملی تو حالات سے مجبور ہو کر ان حضرات کو بھی ہتھیار ڈال دینے کا فیصلہ کرنا پڑا۔

اور اس ہنگامہ کے فرو ہونے کے فوراً بعد ان حضرات نے اپنی تمامتر توجہات دین اسلام کے بقا و تحفظ پر مرکوز کر دی اور اس کی فکر کرنے لگے کہ اس برصغیر میں انگریزی حکومت کے لائے ہوئے الحاد و دہریت اور طوفان عیسائیت سے ملک و ملت کو محفوظ رکھنے کی کیا تدبیر کی جائے، تاکہ آئندہ ہمارے عقائد و اخلاق اور اعمال و افکار آنے والی طاقت کے جدید تہذیب و تمدّن سے

متأثر نہ ہونے پائیں۔

قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ اور آپ کے رفقاء و احباب نے مل کر ان تمام صورت حال کا جائزہ لیا، مرشد وقت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بھی اس سلسلہ میں مشورہ کیا گیا، مل جل کر سبھوں نے طے کیا کہ پورے برصغیر میں آزاد دینی مدارس کا سلسلہ شروع کیا جائے، اور ان مدارس کے تمام تر اخراجات کا بار خود مسلمان برداشت کریں، اور سب سے پہلا مدرسہ بجائے کسی بڑے شہر کے قصبہ دیوبند میں قائم کیا جائے چنانچہ اس پالیسی کے مطابق ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ، ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء اس مدرسہ کی بنام خدا داغ بیل ڈال دی گئی، جس کا سیدھا سادہ نام "مدرسہ اسلامی عربی" تجویز ہوا، جو آگے چل کر بہت جلد ام المدارس "دارالعلوم دیوبند" کے نام سے پوری دنیائے علم میں مشہور ہوا۔

اسکے کچھ دنوں بعد مظاہر العلوم سہارنپور، منبع العلوم گلاؤٹھی، مدرسہ شاہی مرادآباد مدرسہ تھانہ بھون، جامعہ مفتاح العلوم مئو، مدرسہ امدادیہ دربھنگہ اور دوسرے مدارس قائم ہوتے چلے گئے، ان تمام مدارس کا تعلق کسی نہ کسی درجہ میں دیوبند کے مدرسہ اسلامی عربی سے قائم تھا بہت سارے مدارس حضرت نانوتویؒ کی زندگی ہی میں قائم ہو چکے تھے۔

ادھر انگریزوں نے اس کی بھی درپردہ سعی کی کہ مشرقی علوم کا ادارہ قائم کر کے ہندوستان کے باشندوں کو سرکاری مدارس میں پڑھنے پڑھانے

کا عادی بنایا جائے تاکہ ان کا ذہن اور دل و دماغ ہندوستانی ہونے کے بجائے فرنگی بن سکے، فرانسیسی مستشرق گارسان دتاسی نے لکھا ہے۔

"اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستانی نوجوان نہ صرف مشن اسکولوں بلکہ سرکاری مدارس میں جو تعلیم حاصل کر رہے ہیں اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ عیسائیت کی طرف مائل ہوں گے" (ترجمہ خطبات گارسان ص۴۰۸)

اس نظامِ تعلیم سے حکومتِ وقت کو یہ فائدہ پہنچا، چنانچہ یہی مستشرق لکھتا ہے :-

"یورپین علوم کا جس قدر چرچا بڑھتا جا رہا ہے اسی قدر ہماری تہذیب و تمدن اور ہمارے اصولِ مذہبی سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں، ہندوستان میں تبلیغ مسیحیت کو کامیابی حاصل ہو رہی ہے..... روز بروز دین مسیحی کے ماننے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے" (ایضاً ص۴۸۷)

اندازہ لگائیں کہ وہ کیا وقت تھا اور یہاں کے مسلمان کس امتحان سے گذر رہے تھے، چنانچہ انہی حالات کا نتیجہ تھا کہ دارالعلوم دیوبند اور دوسرے مدارسِ دینیہ کا نصابِ تعلیم خالص مذہبی اور ٹھیٹھ دینی رکھا گیا، قرآن و حدیث اور فقہ و کلام اس نصاب کے بنیادی فنون تسلیم کئے گئے، اور ان فنون میں صلاحیت اور کمال حاصل کرنے کے لئے ان کے معاون فنون صرف، نحو،

ادب، منطق، فلسفہ، ریاضی وغیرہ کو جگہ دی گئی تاکہ جو افراد یہاں سے تیار ہو کر نکلیں ان کی نظر دُور رس اور عمیق ہو، اور وہ خواص وعوام کی دینی رہنمائی کا فریضہ اس طرز مخصوص پر خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں جو انبیاء علیہم السلام کا طریقہ رہا ہے۔

علوم جدید سے صَرف نظر کی وجہ خود قاسم العلوم حضرت نانوتویؒ سے سنئے، فرماتے ہیں :-

" درباب تحصیل یہ طریقہ خاص کیوں تجویز کیا گیا اور علومِ جدیدہ کو کیوں شامل نہ کیا ؟ منجملہ دیگر اسباب بڑا سبب اس بات کا ایک تو یہ ہے کہ تربیت عام ہو یا خاص اس پہلو کا لحاظ چاہیئے جس طرف سے ان کے کمال میں رخنہ پڑا ہو، سو اہلِ عقل پر روشن ہے کہ آج کل تعلیم علوم جدیدہ تو بوجہ کثرتِ مدارس سرکاری اس ترقی پر ہے، کہ علوم قدیمہ کو سلاطین زمانہ سابق میں بھی یہ ترقی نہ ہوئی ہو گی، ہاں علومِ نقلیہ کا یہ تنزل ہے کہ ایسا تنزل بھی کسی کارخانہ میں نہ ہوا ہو گا، ایسے وقت میں رعایا کو مدارس علومِ جدیدہ کا بنانا تحصیل لاحاصل نظر آتا ہے اور صرف بجانب علوم نقلی اور نیز ان علوم کی طرف جن سے استعداد علوم مروّجہ اور استعداد علومِ جدیدہ یقیناً حاصل ہوتی ہے ضروری سمجھا گیا۔" (تقریر حضرت نانوتویؒ روداد مدرسہ اسلامی عربی سنہ ۱۲۹۰ھ)

دوسری بات یہ بھی پیش نظر تھی کہ ایک وقت میں مختلف زبانوں اور علوم کی تحصیل کا بار استعداد کے لئے نقصان دہ ثابت ہوگا، چنانچہ آپ نے یہ بھی فرمایا :-

"دوسرے یہ کہ زمانہ واحد میں علوم کثیرہ کی تحصیل سب علوم کے حق میں باعث نقصان استعداد ہوتی ہے۔"

چنانچہ اس کا تجربہ بھی یہی بتاتا ہے، دارالعلوم دیوبند کے بانیوں کے پیش نظر یہ بات تھی کہ علومِ دینیہ کا نصاب مکمل کرنے کے بعد علومِ جدیدہ میں وقت لگایا جائے اور ان علوم میں کمال پیدا کیا جائے، حضرت نانوتوی رح نے اپنی تقریر میں وضاحت سے فرمایا ہے :-

"اس کے (یعنی دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے) بعد طلبہ مدرسہ ہذا، مدارس سرکاری (کالج، یونیورسٹی) میں جاکر علوم جدید کو حاصل کریں تو ان کے کمال میں یہ بات زیادہ موید ہوگی۔"

(تقریر حضرت نانوتوی رح روداد مدرسہ اسلامی عربی ۱۲۹۰ھ)

اللہ تعالیٰ نے دارالعلوم دیوبند کو غیر معمولی عظمت و مقبولیت عطا فرمائی ہے، جس کے نتیجہ میں اس سے ملک و ملت اور دین و مذہب کی بڑی اہم خدمتیں انجام پذیر ہوئی ہیں، اس کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ دارالعلوم محض ایک تعلیمی درسگاہ ہی نہیں ہے بلکہ ایک عملی تربیت گاہ بھی ہے، جہاں علم کی دولت کے ساتھ عمل ... اخلاق ... کے ساتھ طلبہ ...

ہوتی ہے، چنانچہ دنیا جانتی ہے کہ یہاں سے پڑھ کر نکلنے والوں میں جہاں علمی وقار، خودداری، عزتِ نفس اور استغناء پایا جاتا ہے وہیں ان میں خاکساری، تواضع، سادگی اور زہد و تقویٰ کے جذبات بھی ہوتے ہیں اور عشقِ الٰہی اور محبتِ رسول کا سوز و ساز بھی، اس نے حق کے معاملے میں کبھی مداہنت گوارا نہیں کی، کتاب و سنت کی روشنی میں جس بات کو حق سمجھا۔ علی الاعلان کہا۔

برصغیر کے تعلیمی اداروں میں دارالعلوم دیوبند کو جو امتیاز حاصل ہے وہ کسی بھی منصف اور اہلِ علم سے مخفی نہیں، عوامی چندہ سے تعلیمی نظام چلانے کا طریقہ اسی کا ایجاد کردہ ہے، چنانچہ اس کی ایک سابق روداد میں صراحت بھی ہے۔

"تمام مدارس اسلامیہ میں مدارسِ اسلامیہ دیوبند کو یہ عزت حاصل ہے کہ وہ سب سے پہلا چندہ کا مدرسہ ہے، جو عین ایسے وقت میں قائم ہوا جب عام قلوب نے اس کی ضرورت کو محسوس بھی نہیں کیا تھا، حق تعالیٰ مغفرت فرمائے بانیانِ مدرسہ کی کہ انھوں نے فراستِ ایمانی سے آنے والے سیلاب کا اندازہ کرکے سب سے اوّل یہ سدِّ سکندری قائم کی۔"

(روداد دارالعلوم دیوبند سنہ)

اور ایسا ہونا ضروری تھا، اس لئے بانیٔ دارالعلوم حضرت نانوتویؒ نے

اپنے قلم سے جو اصولِ ہشتگانہ تحریر فرمایا ہے اس میں یہ دفعات بھی موجود ہیں :-

"اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں، اس وقت تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا، اور اگر کوئی آمدنی یقینی حاصل ہو گئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ، تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف و رجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے، ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امدادِ غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا، القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی رہے۔

(۲) سرکاری شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

(۳) تا مقدور ایسے لوگوں کا چندہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندے سے امید ناموری نہ ہو، بالجملہ حسن نیت اہلِ چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔"

(دیکھئے دارالعلوم کی صدسالہ زندگی ص۱۸)

بانیانِ دارالعلوم دیوبند کے اخلاص اور حسن نیت کا ہی نتیجہ ہے کہ

آج ... [illegible]

اسی نقشِ قدم پر چل رہے ہیں جو بانیان دارالعلوم نے تجویز فرمایا تھا، ملک وبیرون کے گوشہ گوشہ میں فضلائے دیوبند کے تلامذہ پھیل چکے ہیں اور جو زہر ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی حکومت کے ذریعہ یا ۱۹۴۷ء کے بعد متعصب برادرانِ وطن کی راہ سے دماغوں اور ذہنوں کو مسموم کرسکتا ہے اس کیلئے قریاق کا کام انجام دے رہے ہیں، اور ان شاء اللہ دیتے رہیں گے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ نے بجا لکھا ہے:-

"دارالعلوم نے ان بدلتے ہوئے حالات میں جو سب سے بڑا کام کیا وہ یہ کہ مسلمانوں میں بلحاظ دین ومذہب اور بلحاظ معاشرت تبدیلی نہیں ہونے دی کہ وہ حالاتِ زمانہ کی رَو میں بہ جائیں، بلکہ انھیں پختگی اور عزیمت کے ساتھ اپنی سادگی اور دینی ثقافت کے زاہدانہ ومتوکلانہ اخلاق پر قائم رکھا، مگر اس حکمت کے ساتھ کہ عوام کی حد تک اندرونی حدود وجائز توسعات سے گریز نہیں کیا، جو بدلتے ہوئے تمدن ومعاشرت میں طبعی طور پر ناگزیر تھا، مگر خواص کی حد تک دائرہ وسیع نہیں ہونے دیا، جس سے عام مسلمانوں میں اسلامی مدنیت کا سادہ نقشہ قائم رہا اور جدید تمدن اور معاشرتِ اغیار کی نقالی کا غلبہ نہیں ہوسکا، اسلامی غیرت وحمیت باقی رہ گئی اور مرعوبیت کا

وہ احساسِ کمتری قلوب میں جمنے نہیں پایا۔" (صدسالہ تاریخ ص۲۷)

غیروں نے بھی دارالعلوم کی ان خدمات کا اعتراف کیا ہے اور اسکی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے، ایک صاحبِ فکر و نظر لکھتے ہیں:

"خدا بھلا کرے بانیین دارالعلوم دیوبند رحمہم اللہ کا کہ ان کی کوششوں کی بدولت قال اللہ اور قال الرسول کا ڈنکا کم از کم عوامی سطح پر بجتا رہا اور عوام کے معتقدات و معمولات میں دین و مذہب کا ایک ڈھانچہ محفوظ رہ گیا۔"

آگے تحریر فرماتے ہیں:

"متذکرہ بالا جدید مذہبی عقلیت کے مقابلہ میں نقل کی دفاع کا سب سے بڑا مرکز دیوبند بنا، جس نے قال اللہ اور قال الرسول کے حصار میں محصور ہو کر مذہب کا تحفّظ کیا، ہم پہلے بھی یہ خیال ظاہر کر چکے ہیں کہ دیوبند ایک درسگاہ دارالعلوم ہی نہیں، ایک عظیم تحریک ہے جس نے اس دور میں مؤثر رول ادا کیا، اور جس سے متعدد علمی و عملی سوتے پھوٹے، چنانچہ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے بعد شیخ الحدیث مولانا انور شاہ کشمیریؒ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مجاہد حریت مولانا حسین احمد مدنیؒ، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، اور مبلغ ملت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی تمام علمی و روحانی،

مذہبی وسیاسی اور دعوتی وتبلیغی سلسلوں کا اصل منبع دیوبند ہی ہے، حتیٰ کہ اوپر کی مثال کے مطابق حقیقت یہ ہے کہ برصغیر کی اکثر دینی درسگاہوں اور دینی ومذہبی تحریکوں کا تعلق بھی دیوبند کے ساتھ وہی ہے جو دنیا بھر کی مساجد کا خانہ کعبہ کے ساتھ اور برصغیر کے مذہبی عناصر سے صرف ان کو چھوڑ کر جن کی مذہبیت بس عُرس ومیلاد اور فاتحہ ودرود تک محدود ہے بقیہ تمام فعّال مذہبی عناصر تحریک دیوبند ہی کی مختلف شاخوں سے متعلق ومنسلک ہیں ۔" (میثاق لاہور)

ایک اور صاحب فکر ونظر تحریر فرماتے ہیں :-

"تاہم اس حقیقت سے کوئی ہوشمند انسان انکار نہیں کرسکتا کہ (دارالعلوم) دیوبند کے فضلاء نے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل کر دین خالص کی جس طرح حفاظت کی ہے اور اس کو بدعت، تحریف اور تاویل سے محفوظ رکھا ہے، اس سے ہندوستان میں اسلامی زندگی کے قیام وبقا اور استحکام میں بیش قیمت مدد ملی ہے، اور آج جو صحیح اسلامی عقائد، دینی علوم، اہل دین کی وقعت اور صحیح روحانیت اس ملک میں نظر آتی ہے اس میں بلاشبہ اس کا نمایاں اور بنیادی

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد اگر دیوبند کی تحریک نہ ہوتی اور اس کے اسلاف و اکابر اور فضلاء کی خاموش خدمات سے یہاں مسلمان متاثر نہ ہوتے تو برصغیر میں اسلام کی اصلی صورت یا تو مسخ ہو چکی ہوتی، یا اس کا نام و نشان تک مٹ چکا ہوتا، علامہ اقبال نے حکیم احمد شجاع کے جواب میں بہت درست کہا تھا:-

"ان مکتبوں (مدرسوں) کو اسی حالت میں رہنے دو، غریب مسلمانوں کے بچّوں کو انہی مدرسوں میں پڑھنے دو، اگر یہ مُلّا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہو گا؟ جو کچھ ہو گا میں انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں، اگر ہندوستانی مسلمان ان مدرسوں کے اثر سے محروم ہو گئے تو بالکل اسی طرح جس طرح اندلس میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈرات اور الحمراء، اور باب الاخوتین کے نشانات کے سوا اسلام کے پیرؤوں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا، ہندوستان میں بھی آگرہ کے تاج محل اور دلّی کے لال قلعے کے سوا مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔"

یہ واقعہ ہے کہ برصغیر میں کتاب وسنت کی تعلیم وتربیت اور دین کا قیام وبقا مدارس دینیہ کی خدمات کا نتیجہ ہے، مسجدیں آباد ہیں اور ان کے میناروں سے اللہ اکبر کی صدائیں روزانہ سننے میں آتی ہیں اور ان گھرانوں میں بھی علم وفضل پہنچ چکا ہے جن کو دو وقت پیٹ بھر کھانا بھی میسّر نہیں آتا، بلکہ محراب ومنبر سے ان کے بہت سے افراد ملک وملّت کو اخلاق حسنہ اور اعمال صالحہ کی ترغیب دیتے نظر آتے ہیں۔

مدارس دینیہ کی خدمات کا اندازہ اس سے کر سکتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند سے جو فضلاء اس کا پورا نصاب پڑھ کر نکل چکے ہیں ان کی تعداد کوئی سترہ اٹھارہ ہزار ہے، ان میں غیر ممالک کے فضلاء کی تعداد پانچ ہزار ہے، ان غیر ممالک میں افغانستان، روس، چین، برما، ملیشیا، انڈونیشیا، عراق، کویت، ایران، سیلون، جنوبی افریقہ، زمبیا، سعودی عرب، سیام، کمبوڈیا، تھائی لینڈ، ری یونین، بنگلہ دیش، نیپال اور یمن وغیرہ داخل ہیں، اس کے علاوہ ان لوگوں کی تعداد جنھوں نے ناظرہ قرآن، تجوید اور ابتدائی عربی کی تعلیم حاصل کی اور عربی نصاب پورا کرنے کی نوبت نہیں آئی، ستّر ہزار سے زیادہ ہے جو باضابطہ فضلاء کی تعداد سے کئی گُنا زیادہ ہے، اس طرح صرف دارالعلوم دیوبند سے مستفید ہونے والوں کی تعداد کم وبیش ایک لاکھ ہو جاتی ہے، حالانکہ دیوبند کے علاوہ اس ملک میں ہزاروں مدارس دینیہ اور بھی مختلف شہروں، دیہاتوں اور قصبات میں سرگرمِ عمل ہیں اور ان کا کسی نہ کسی درجہ میں دارالعلوم دیوبند سے بھی تعلق ہے۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا کرے حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ اور آپ کے احباب وتلامذہ کو جنھوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد عیسائیت کا جم کر مقابلہ کیا، اور کوچہ و بازار میں پھر کر اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مناقب وفضائل بیان کئے اور پادریوں کے اعتراضات کے مدلّل ومسکت جواب دے کر انھیں خاموش ہونے پر مجبور کر دیا، اور تصنیف وتالیف کے ذریعہ مسلمانوں کو اس قدر مسلّح کر دیا کہ پادریوں کو میدان چھوڑ کر گھروں اور گرجاؤں میں پناہ لینے پر مجبور ہونا پڑا، اس سلسلہ میں دوسرے علماء نے بھی بڑی اہم خدمات انجام دیں بالخصوص بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ (م ۱۳۴۶ھ) نے کئی درجن کتابیں لکھیں اور انھیں بہت زیادہ تعداد میں شائع فرمایا۔

انگریزی حکومت کے ایماء سے اس ملک میں بہت ساری گمراہ کن سیاسی اور مذہبی تحریکیں اٹھیں، اور ان تحریکوں کے ذریعہ یہاں کے باشندوں خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کو راہ راست سے ڈگمگانا چاہا، مگر دارالعلوم دیوبند اور اس کے علماء نے پامردی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور بحمداللہ ان کوششوں کی بدولت مسلمان انگریزی حکومت وسیسہ کاریوں سے محفوظ رہے۔

آریہ سماجی تحریک خود حضرت نانوتویؒ کی حیات میں بڑے طمطراق کے ساتھ میدان میں آئی اور اس کے نام پر اسلامی احکام ومسائل پر غلط اعتراضات شروع ہوئے، حضرت نانوتویؒ نے بہ نفس نفیس اس کا مقابلہ کیا

اور پھر آپ کے تلامذہ نے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس دھوکے میں نہیں آئے بلکہ خود اس کے مبلغوں کو منہ کی کھانا پڑی۔

پھر ایک زمانہ میں شدھی سنگٹھن کا جھگڑا پیدا کیا گیا، اور مسلمانوں کو مرتد کرنے کی سعی کی گئی، مگر علماء دیوبند یہاں بھی سینہ سپر ہو گئے اور نتیجہ میں اس تحریک کو بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، اور انگریزی حکومت کا یہ جادو بیکار ثابت ہوا۔

دارالعلوم دیوبند اور اس کے فضلاء نے جہاں درس و تدریس، وعظ و تقریر اور تبلیغ و اشاعت دین کے ذریعہ برصغیر میں اسلام اور مسلمانوں کی دینی و ملی خدمات انجام دیں، وہیں اس نے اور اس کے فرزندوں نے روحانی اعتبار سے بھی اس ملک کی بیش بہا خدمات کا فریضہ ادا کیا، ارشاد وبیعت، تزکیۂ قلوب اور تصفیۂ باطن کی راہ سے بلا مبالغہ لاکھوں انسانوں کو راہِ راست اور عقائد صحیحہ پر قائم رکھا اور ان کے دلوں کی دنیا کو خدائے ذوالجلال کے ذکر و فکر سے منور کیا۔

برصغیر میں علمائے ربانیین نے اپنی سادگی کس مپرسی کے باوجود مذہبی و دینی فضا کو کبھی گرد آلود نہیں ہونے دیا، بلکہ قلب و دماغ کو جلا بخشنے کے لئے تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا، سیکڑوں ہزاروں کتابیں تصنیف کیں، انھیں شائع کرایا اور عوام و خواص تک پہنچانے کی جد و جہد کی،

[illegible]

نہیں لکھی گئیں، صرف حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے قلم سے ہزار سے زیادہ کتابیں لکھی گئیں اور لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔

علمائے دیوبند میں حضرت نانوتویؒ، حضرت گنگوہیؒ، حضرت شیخ الہندؒ حکیم الامت حضرت تھانویؒ، حضرت کشمیریؒ، حضرت علامہ عثمانیؒ، مولانا اعزاز علیؒ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، مولانا بدر عالمؒ، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، مولانا مدنیؒ مولانا عبید اللہ سندھیؒ، مولانا منصور انصاریؒ، مولانا سید محمد میاںؒ، مفتی کفایت اللہؒ اور دوسرے سیکڑوں علماء نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں ان میں بڑی بڑی ضخیم مجلدات بھی ہیں، جن سے ملک و ملّت کو بے انتہا فائدہ پہنچا۔

اس وقت بھی زندہ علماء میں حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت الاستاذ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا ابوالحسن علی ندوی قاضی زین العابدین، حامد الانصاری غازی، مفتی عتیق الرحمٰن، حکیم محمد زماں صاحب مولانا منت اللہ رحمانی دامت برکاتہم اور دوسرے سیکڑوں علماء ہیں جن کے زبان اور قلم سے ملک و ملّت فیضیاب ہے اور خدا کرے بہت دنوں تک فیضیاب ہوتا رہے

جو کچھ اختصار سے عرض کیا گیا، اس سے یہ بات کھل کر سامنے آ گئی ہو گی کہ دارالعلوم دیوبند، اس کے اسلاف و اکابر اور فضلاء نے ہمت و جرأت اور محنت [illegible] ہر رنگ سونا علم و فن

فضل وکمال اور زہد وتقویٰ کے جو زندہ جاوید آثار نظر آتے ہیں، برصغیر ان سے محروم ہوتا۔

برصغیر کی آزادی میں بھی دارالعلوم دیوبند کا بنیادی حصہ ہے، بلکہ کہنا چاہیئے، اس کے اسلاف واکابر اور فضلاء کی جدوجہد اور رہنمائی کی رہین منت ہے، اس وقت تک یہ حضرات چین سے نہیں بیٹھے جب تک ملک آزاد نہیں ہوگیا گو آزادی کے بعد علماء کرام اور دارالعلوم دیوبند کا نام لیتے ہوئے کچھ متعصب ہچکچاتے ہیں، مگر کون نہیں جانتا کہ ملک کی آزادی کے لئے شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ، مولانا عزیر گلؒ، اور مولانا نصرت حسینؒ کو اسیر مالٹا بننا پڑا، اور برسوں انھوں نے وہاں رہ کر مصائب جھیلے، حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور مولانا منصور انصاریؒ کو جلاوطنی کی زندگی گذارنا پڑی اور مولانا منصور انصاریؒ کو پھر اپنے وطن ہندوستان آنا نصیب نہیں ہوا۔ مفتی کفایت اللہؒ، مولانا احمد سعیدؒ، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا محمد میاںؒ اور دوسرے سیکڑوں علماء نے لاٹھیاں کھائیں اور برسہا برس جیل میں رہے اور قید وبند کے مصائب وآلام سے دوچار ہوئے دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ کے ایک اہم رکن حضرت مولانا منت اللہ جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ بحمداللہ موجود ہیں جو آزادی کی خاطر انگریزی دورِ حکومت میں کئی سال جیل کی مصیبت جھیل چکے ہیں، ان سے [illegible]

تکلیفیں کس صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کرتی تھی۔

آزاد ہندوستان میں بھی دارالعلوم دیوبند اور اس کے اسلاف و اکابر اور فضلا نے جہاں اس کی تعمیر نو میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور لے رہے ہیں وہیں یہ سب اسلامی احکام و مسائل کے تحفظ کے لئے بھی آگے آئے۔

مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے لئے دارالعلوم دیوبند ہی میدان عمل میں آیا اس کے سربراہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم کے بیان پر ملک چونکا اور بمبئی کنونشن منعقد ہوا، جس میں سارے ملک اور ملک کی تمام تنظیموں اور دانشوروں نے حصہ لیا، اور مسلم پرسنل لا بورڈ بنا جو آج پورے ملک میں سرگرم عمل ہے۔

جیساکہ پہلے عرض کیا گیا کہ دارالعلوم دیوبند کے قیام کا بنیادی مقصد کتاب و سنت کی اشاعت، دین کو اس کی صحیح صورت میں برقرار رکھنا اور گھر گھر پہنچانا، اسلامی تعلیمات کے بقا، و تحفظ کی جد و جہد اور ساتھ ہی نئے مذہبی اور سیاسی فتنوں سے ملّتِ اسلامیہ کو آگاہ کرنا اور ان کے فریب سے محفوظ رکھنا ہے، جس میں وہ الحمد للہ اب تک کامیاب رہا ہے۔ اور آئندہ بھی اسی کی توقع ہے۔

دنیا آج ایک نئے انقلاب سے دوچار ہے، جو بڑی تیزی کے ساتھ پھیلتا جا رہا ہے، غور و فکر کے پیمانے بدل رہے ہیں اور انسانی فکر و نظر اس انقلاب ... متأثر ...

پھر چودھویں صدی ہجری ختم ہو رہی ہے اور پندرھویں صدی ہجری کی آمد آمد ہے، اس موقع سے دارالعلوم دیوبند کے ذمہ داروں نے فیصلہ کیا ہے کہ صد سالہ اجلاس کے نام پر ایک بین الاقوامی پرشکوہ عالمی اجتماع بلایا جائے، جس میں دنیائے اسلام کے ذی رائے اور دوراندیش علماء و مشائخ، دانشوروں، ملّت کے بہی خواہوں، نیز مختلف دینی وملّی درسگاہوں اور تنظیموں کے ممتاز اساتذہ کرام اور سربراہوں کو دعوت دیجائے، اوران کے سامنے ماضی کا جائزہ اور حال کا تجزیہ پیش کر کے مستقبل میں علومِ دینیہ کی اشاعت و ترویج، مسلمانوں کی باہمی تنظیم و ترقی اور موجودہ دور کی وجہ سے جو نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں ان سب کا حل تلاش کیا جائے، تاکہ آنے والے دور میں ملّت اسلامیہ کامیاب زندگی سے ہمکنار ہو سکے اور زمین کے مختلف گوشوں میں بسنے والے مسلمان اخوت و محبت کے ساتھ باعزت اور پُروقار زندگی کے مالک بن سکیں۔

اس صد سالہ اجلاس میں ان ہزاروں علماء کرام کو دستار فضیلت بھی دی جائے گی جنھوں نے ۱۳۲۸ھ کے بعد یہاں سے فراغت حاصل کی ہے، اوران تمام مدارس دینیہ میں باہم رابطہ قائم کرنے کی بھی سعی کی جائے گی، جو صحیح مسلک رکھتے ہیں، اور کتاب و سنت کی تعلیم و تدریس میں مشغول ہیں۔